شکوہ ظلمت شب سے کہیں بہتر تھا!

تحریر: مشہود علی

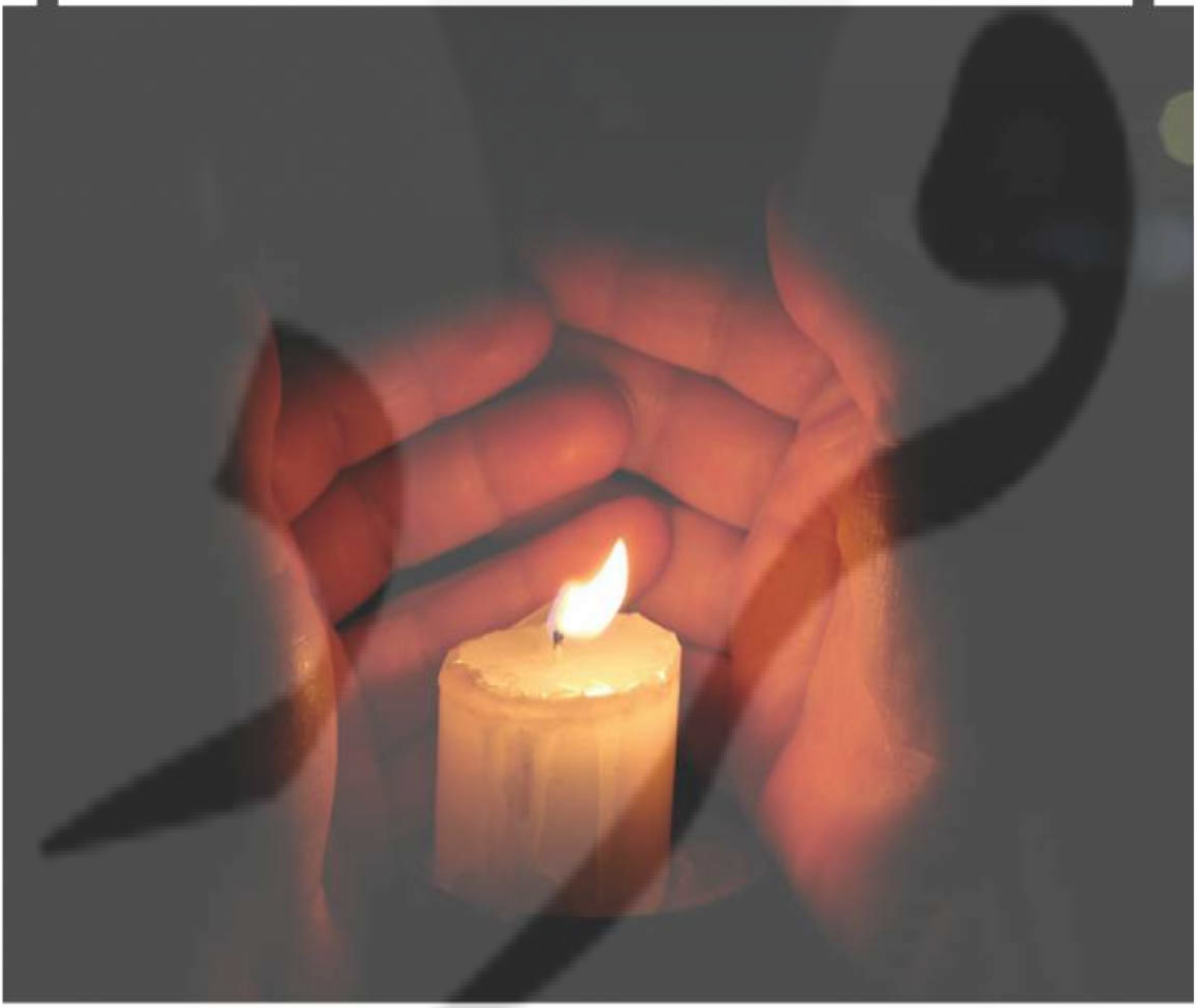

میرے نزدیک کرہ ارض پر بسنے والی نسل آدم کی صرف دو ہی اقسام ہیں ایک وہ جو معاشرے کے بگاڑ کو خود کی نا اہلی سمجھتے ہیں اور اس میں تبدیلی کا باعث بن کر تاریخ رقم کر جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس بگاڑ سے سمجھوتہ کر کے اس کو اپنی تقدیر مانتے ہیں کے یہ چیز ہماری قسمت میں لکھ دی گئے ہے۔ تاریخ شاید ان لوگوں کا حوالہ کبھی نہیں دیتی جنھوں نے تاریخ کو کچھ نہ دیا۔ ہمیشہ ان ہی لوگوں کی مثالیں دی گئیں جو ملک وملت کے لیے کچھ کر گئے۔

ہم ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتے ہیں جو ابھی تک ترقی پذیر ممالک کی دوڑ میں لنگڑاتا ہوا چل رہا ہے کیونکہ ایک کام ہے جو ہم پچھلے ۷۰ برس سے ایمانداری سے کرتے آرہے ہیں وہ ہے شکوہ۔ ہم سب سیاسی تجزیہ نگار بہت اچھے ہیں ملکی سیاست پر بات کرنے کے لیے ہم پاکستانیوں کو کسی سیاسیات کی ڈگری کی ضرورت نہیں ہم چائے کا کپ ہاتھ میں لیئے ہوٹل میں پنکھے یا ائیر کنڈیشنر والی ٹیبل پر بیٹھ جاتے ہیں اور جتنی جدید گالیاں جانتے ہیں سیاستدانوں کی نذر کر دیتے ہیں۔ گلی کے چوک پر بیٹھ کر مذہبی انتہا پسندی پر خوب بحث کر سکتے ہیں۔ تعلیم کے فرسودہ نظام پر تعلیم یافتہ لوگ بڑی خوبصورت دلیلوں کی روشنی میں اس علم کی شمع کو بجھنے پر نوحہ کناں ہوتے ہیں، منشور نہیں پڑھتے البتہ، رنگ نسل، مذہب، زبان کی بنیاد پر ہم اپنی اور اپنی ملک کی تقدیر کا فیصلہ کرتے ہیں خود ہی نمائندگان کا انتخاب کرتے پھر خود ہی ان کو کوستے، لیکن ان سب کے باوجود ہم شاید دنیا کی وہ واحد قوم ہیں جو جان کر جیتی نہیں البتہ جان کر مرتی ضرور ہیں۔ کیونکہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی ہم انجان بن کر اپنی زندگی گزارتے ہیں اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہم میں ہر دوسرا شخص مسئلہ بتا سکتا ہے لیکن حل بہت کم ہی بتایا جاتا ہے۔

دنیا کی تمام اقوام وقتاً فوقتاً مسائل سے دوچار رہی ہیں لیکن ان تمام قوموں نے وقت کے ساتھ چلنا سیکھا ہے ہمارے نزدیک ترقی یافتہ ممالکوں کی کئی مثالیں ہیں چائنہ اور جاپان جیسی اقوام جن مسائل سے گزری وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ممالک نے اس مشکل دور میں ایک دوسرے پر الزام تراشی کی یا درپیش مسائل سے نمٹنے کے لیے نئی اور جدید حکمت عملی اپناتے ہوئے ان مسائل کو حل کیا؟ آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اپنی تحریر کے ذریعے ایسے کسی سوال کا جواب آپکے سامنے پیش کروں گا لیکن میری یہ تحریر آپکے کسی سوال کا جواب نہیں بلکہ خود آپکے ذہنوں میں کئی سوال چھوڑنے والی ہے۔

ایک مثال آپکے سامنے پیش کرنا چاہوں گا جو کہ میری آنکھوں دیکھی ہے۔ پاکستان میں صوبہ سندھ کے سب سے بڑے شہر کراچی کی ایک بڑی اور اہم شاہراہ، شاہراہِ فیصل ہے۔ اس پہ موجود ٹریفک کا ہجوم اور اس سے اُٹھنے والا گرد وغبار، تمام گاڑیوں میں موجود مسافروں کو بہت پریشان کر رہا تھا۔ اتنے میں ہم سب لوگ حکومت پر الزام لگاتے ہوئے کہنے لگے کہ کوئی طریقہ کار نہیں ہے، کوئی قانون نہیں ہے جو اس معاشرے کو ٹھیک کر سکے، ہمارے ملک کو مزید بہتر بنا سکے۔ ہم سب شکوے کر رہے تھے اور حکومت کی نا اہلی پر تمہید باندھ رہے تھے کہ اتنے میں میں نے دیکھا کے ایک شخص اس ٹریفک کی رکاوٹ کو ختم کرنے کی نیت سے اُٹھا اور آگے بڑھنے لگا۔ وہ ٹریفک میں رکاوٹ کو ختم کرنے کی کوششوں میں لگا رہا تھا۔ وہ آدھے سے ایک گھنٹے تک دھوپ میں سڑتے ہوئے ہر ایک گاڑی نکلوانے کی کوشش میں لگا رہا۔ بظاہر وہ وہاں موجود ہر ایک شخص کی نظر میں بیوقوف تھا، لیکن میں اس منظر کو دیکھتا رہا اور میرے اردگرد موجود ہر شخص مجھے محض ایک سوال لگ رہا تھا۔ وہ سوالیہ نشان لگ رہا تھا معاشرے پر، وہ مجھے سوال لگ رہا تھا اس ملک کی سلامتی پر، وہ مجھے سوال لگ رہا تھا ہر ایک اعتبار سے۔ ہم سوال کرنے والوں میں سے تھے۔ سوالوں کے اس ڈھیر میں وہ ایک شخص جو امید تھا، وہ ایک اکیلا شخص اس بھیڑ کی ذمہ داری لیتے ہوئے میرے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ ہی چیز میرے ذہن میں گردش کرتی رہی اور میں مستقل سوچتا رہا۔ اگر دنیا کا ہر ایک شخص سوال کرنے والا ہوتا اور وہ معاشرے کو کچھ دینے کے بجائے خود معاشرے پر بوجھ بن جاتا اس کا وجود بھی اس سے ناخوش ہوتا تو کیا آج نسل آدم کا وجود بھی رہتا؟ اگر اندھیرے کی غلامی کرتے رہتے تو کیا بلب بنتا؟ واقعی اگر ہر شخص سوال ہوتا تو کیا معاشرے کے مسائل کبھی حل ہوتے۔ اگر تھومس ایڈیسن اندھیرے کی شکایت ہی کرتا رہتا تو کیا آج ہم روشنی سے آشنا ہوتے؟ اگر گراہم بیل دوری کا شکوہ ہی کرتا رہتا تو کیا کبھی ٹیلیفون بنا پاتا؟ اندھیرے میں جب جب دیپ جلائے گئے ان سے اندھیرا کبھی ختم نہیں ہوا بلکہ اندھیرے میں کمی ضرور آجاتی ہے یہ تمام محض چھوٹے چھوٹے سوال تھے۔ اور اب آپ خود سے پوچھیں، کیا آپ معاشرے کے لیے سوال ہیں یہ جواب؟ اگر آپ خود واقعی ان تمام مسائل کا حل ہیں تو ٹھیک ورنہ دنیا کبھی بھی برے لوگوں کی برائی کی وجہ سے بری نہیں بلکہ اچھے لوگوں کی خاموشی کی وجہ سے بری کہلاتی ہے۔ تو اپنے آرام دہ کمروں سے نکل کر ذرا اک قدم اٹھائیں اپنے بچوں کی سلامتی و بہتری کے لیئے ہمارا پہلا قدم کسی اور کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے ہی ہے اپنی اولاد کے بہتر سے

بہترین مستقبل کے لیے ہی ہے، کیونکہ وہ جو گھر کے دالان میں پروان چڑھ رہا ہے اسکے کے لیے آسانیاں پیدا کریں اس کے مستقبل روشن اور تابناک بنائیں، اور یہ ایک جملہ ذہن میں بٹھالیں کہ بدلاؤ صرف مجھ سے ممکن ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس چیز کو بھی ذہن نشین کرلیں کہ ہم ٹھیلے پر ملنے والے ہار سے لیکر کار تک ٹیکس دیتے ہیں، تو پھر ہمارے ادارے کیا کرر ہے؟

چلیں آج ایک اور حقیقت سے روشناس ہوتے ہیں، محکمہ پولیس یقیناً یہ نام سن کر آپ کے ذہن میں کسی رشوت خور، بلاوجہ سڑک پر روک کر پریشان کرنے والے کا تصور آیا ہوگا۔ یا پھر آپ سوچ رہے ہوں گے کہ جو کام اس نوجوان نے کیا جو کہ ٹریفک کنٹرول کرر ہا تھا وہ کام تو اس پولیس والے کا تھا اور وہ یہ کام کیوں نہیں کرر ہا تھا جبکہ ہم اسکو اس کام کے لیے پیسے دیتے ہیں اور محکمہ پولیس ان کی با قاعدہ تربیت کرتا ہے ایک غیر تربیت یافتہ انسان اگر ٹریفک کنٹرول کرسکتا ہے تو ایک پولیس والا کیوں نہیں کرسکتا؟

دراصل عام شہریوں کے ذہن میں انکا یہی خاکہ تشکیل پا چکا ہے لیکن پس منظر کچھ یوں ہے کہ یہ اعداد وشمار پاکستان انسٹیٹیوٹ آف لجسلیٹو ڈیولپمنٹ اینڈ ٹرانسپیرنسی (پلڈاٹ) پاکستانی ادارہ قانون سازی ترقی وخوشحالی، کی ایک تحقیق کے مطابق ہیں، پنجاب میں ۵۰۷ افراد کے لیے ایک پولیس اہلکار، سندھ میں ۵۲۴ شہریوں کے لیے ایک پولیس اہلکار، خیبر پختونخواہ میں یہ تعداد ۴۱۴، اسی طرح بلوچستان میں ۳۴۶ جبکہ اسلام آباد میں ۱۹ لوگوں پر ایک پولیس اہلکار تعینات ہے۔ پنجاب بھر میں پولیس کی تعداد ایک لاکھ ۸۰ ہزار، سندھ میں ایک لاکھ پانچ ہزار، خیبر پختونخواہ میں پولیس کی تعداد ۶۵ ہزار، اسی طرح بلوچستان میں پولیس ملازمین کی تعداد ۳۸ ہزار جبکہ وفاق میں پولیس ملازمین کی تعداد دو لاکھ آبادی کے لیے گیارہ ہزار ہے، جب کہ عالمی طور پر ۱۰۰۰۰۰ افراد پر ۳۰۰ اہلکار تعینات کرنے چاہیے، اس حساب سے صرف وفاق میں پولیس کی تعداد زیادہ ہے، اور اس تعداد کا ایک بڑا حصہ ہمارے ہی منتخب نمائیدگان اور ان کے بچوں کی حفاظت کے لیے مختص ہوتا ہے، ڈان نیوز کی ایک رپورٹ کے مطابق ۶۰ فیصد پولیس کا عملہ ہمارے منتخب وزیروں، مشیروں، ان کے بچوں، ان کی اہلیا، کی حفاظت میں چاک وچوبند چوکنا رہتے ہیں، اور میں اور آپ محلے میں ہونی والی چوری کی اطلاع دینے کے بعد بھی، راہ تکتے رہتے ہیں اور یہی راگ الاپتے رہتے ہیں کے آخر بھلا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں، ہم کہاں کھڑے ہیں؟ اب تو پاکستان ۷۰ سال کا ہونیوالا ہے! کیا سوچا ہے یونہی رات کی تاریکی میں راگ ہی گنگنا ہے؟ یا پھر آنے والی نسل کے لیے اپنے اپنے حصے کی شمع جلانی ہے؟؟

مصنف انڈویجوئل لینڈ پاکستان مین پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کرر ہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں:
info@individualland.com